© rasailojaraid.com

شریعت اور مسلم معاشرہ

امت مسلمہ کا اجتماعی کردار

ڈاکٹر محمود احمد غازی اسلام آباد

وفاقی شرعی عدالت کے سابق جج اور معروف اسکالر ڈاکٹر محمود احمد غازی کی نئی زیر طبع کتاب "عہدِ حاضر اور شریعتِ اسلامی" کا ایک باب قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔ دراصل انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز-اسلام آباد نے گزشتہ برس ڈاکٹر محمود احمد غازی کے آٹھ خطبات "محاضراتِ شریعت" کے عنوان سے اپنے ہاں منعقد کروائے تھے۔ اسلام آباد اور راولپنڈی کے معروف اہلِ علم نے ان خطبات کو سُنا۔ اب یہ کتاب زیر طبع ہے۔ انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کے شکریہ کے ساتھ ہم ایک خطبہ افادہ عام کے لئے شائع کر رہے ہیں۔ امید ہے قارئین اسے پسند کریں گے۔ (مدیر)

نحمده و نصلی علی رسوله الکریم و علی اله و اصحابه اجمعین

برادرانِ محترم

خواہرانِ مکرم

آج کی گفتگو کا مرکزی نقطہ اور موضوع ہے: امت مسلمہ اور مسلم معاشرہ، اُمت مسلمہ کی اجتماعی ذمہ داریاں اور کردار- امت مسلمہ کی تشکیل قرآن مجید کی رو سے مسلمانوں کا سب سے پہلا اور سب سے اولین اجتماعی ہدف ہے۔ قرآن مجید میں مسلمانوں کو نہ صرف امت مسلمہ کے قیام کا حکم دیا گیا ہے، بلکہ مختلف آیات مبارکہ میں امت مسلمہ کی اہمیت کو بھی بیان فرمایا گیا ہے۔ امت مسلمہ کے خصائص بیان کیے گئے۔ اور امت مسلمہ کے فرائض اور ذمہ داریوں کی نشان دہی کی گئی۔ مختلف احادیث مبارکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف امت سے اپنے تعلق اور گہری وابستگی کو مختلف پیرایوں میں بیان فرمایا، بلکہ جگہ جگہ امت مسلمہ کی اہمیت اور اس کے فرائض اور ذمہ داریوں کی عظمت کو بھی نمایاں فرمایا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس بات سے تو ہم سب واقف ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولین ترجیح امت مسلمہ کی فلاح و بہبود اور امت مسلمہ کے روشن اور تابناک مستقبل کی تعمیر تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دنوں کی تپش اور راتوں کا گداز امت مسلمہ کے بارہ میں فکرمندی سے عبارت تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ امت مسلمہ کی تعمیر و تشکیل کی کاوشوں میں بسر کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ روایت ملتی ہے کہ آپ نے بارہا پوری پوری رات امت مسلمہ کے لیے دعائیں کرنے میں بسر کر دی۔ عید الاضحیٰ کے موقع پر متعدد بار ایسا بھی ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کی طرف سے بھی قربانی ادا فرمائی۔

امت مسلمہ کے ایک انتہائی کمتر اور سب سے ادنیٰ فرد کی حیثیت سے جب میں اس پر غور کرتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جس امت کے لیے قربانی دی تھی اس میں ایک کھرب واں یا دس کھرب واں حصہ شائد میرا بھی ہے، اس سے میرے دل میں ایک عجیب احساس موجزن ہوتا ہے جو یہ داعیہ پیدا کرتا ہے کہ مجھے امت مسلمہ کے بلند اخلاقی معیار کے لیے نہ صرف اپنے کو قابل قبول بنانا چاہیے بلکہ اپنے آپ کو امت مسلمہ کا کامیاب فرد بنانے کے لیے جو صحیح ذمہ داری، تقاضے اور خصائص ہیں انہیں پورا کرنے کی بھی کوشش کرنی چاہیے۔ اس حدیث سے بھی ہم سب واقف ہیں جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ روز قیامت جب اللہ کا ہر نبی اپنے مستقبل اور اپنے سوالات کے جوابات کی فکر میں ہوگا اور اس کی زبان سے نفسی نفسی کے الفاظ نکل رہے ہوں گے اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے اپنی ذات مبارکہ کا نہیں، بلکہ اپنی امت کا حوالہ نکلے گا: یعنی اُمّتی اُمّتی۔ ان مثالوں سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ اسلام کے اجتماعی نظام میں امت مسلمہ کی کیا اہمیت ہے؟ اور امت مسلمہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنی اہمیت کے ساتھ بار بار بیان کیا ہے۔

اسلام میں جو چیزیں مطلوب ہیں، فقہاء کرام کی اصطلاح میں ان کی دو قسمیں ہیں۔ کچھ تو وہ امور ہیں جو براہ راست، یعنی اپنی ذات میں مطلوب و مقصود ہیں۔ یہ امور مقصود کہلاتے ہیں، ان کے بعد بہت سے امور وہ ہیں جو مقصود لغیرہٖ کہلاتے ہیں۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو خود اپنی ذات میں، یا فی نفسہٖ مقصود نہیں ہیں، بلکہ کسی اور مقصد کے حصول کی خاطر مطلوب ہیں۔ امت کا قیام مقصود لعینہ ہے، یعنی مطلوب بالذات ہے۔ اس کے مقابلہ میں ریاست کا قیام مطلوب بالذات یا مقصود لعینہ نہیں، بلکہ مقصود لغیرہٖ ہے۔ ریاست

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی ضرورت امت مسلمہ کے دفاع کے لیے ہے۔ ریاست کی ضرورت امت مسلمہ کے تحفظ کے لیے اور امت مسلمہ کو اپنے فرائض کی انجام دہی میں مدد دینے کے لیے ہے۔ ریاست کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب ایک امت وجود میں آ چکی ہو اور وہ امت اپنے تحفظ کے لیے، اپنے فرائض کی انجام دہی کے لیے ریاست کی محتاج ہو۔

بعض فقہائے اسلام نے دینی فرائض اور شرعی واجبات کی دو قسمیں قرار دی ہیں۔ وجوب یا فرض جو اللہ کی طرف سے عائد ہوتا ہے۔ اس کی ایک قسم وجوبِ مقاصد ہے اور دوسری قسم وجوب وسائل ہے۔ امت کا قیام وجوبِ مقاصد کی نوعیت رکھتا ہے۔ جبکہ ریاست کا قیام وجوبِ وسائل کی حیثیت رکھتا ہے۔

قبل اس کے کہ امت مسلمہ کے خصائص اور امت مسلمہ کی ذمہ داریوں کی بات کی جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لفظ امت کی تشریح اور وضاحت بھی سامنے آ جائے۔ امت سے کیا مراد ہے؟ یہ امت جو دعائے ابراہیمی کا نتیجہ ہے، وہ دعائے ابراہیمی جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی دعا بھی فرمائی تھی۔ اپنے اسلام پر کاربند رہنے کی خواہش بھی فرمائی تھی۔ اسی دعائے ابراہیمی اور اسمٰعیلی میں "ومن ذریتنا امة مسلمةً لک" کے الفاظ بھی آئے ہیں کہ ہماری اولاد اور ذریت میں ایک ایسی امت قائم فرما جو تیرے حکم کی تابعدار اور تیرے فرمان پر چلنے والی ہو۔

یہ بات تو تقریباً ہر پڑھا لکھا مسلمان جانتا ہے کہ عربی زبان میں ہر لفظ کسی نہ کسی اصل یا مادے سے نکلا ہوا ہوتا ہے۔ عربی کے بہت تھوڑے، شاذ و نادر چند الفاظ ایسے ہیں جن کا تعلق کسی خاص مادے سے نہ ہو، ورنہ عربی زبان کے تمام تر الفاظ کسی نہ کسی اصل اور مادے سے ماخوذ اور مشتق ہوتے ہیں۔ امہ کا مادہ ـــ جیسا کہ ہر عربی دان جانتا ہے، بلکہ غیر عربی دان بھی آسانی سے اس کا اندازہ کر سکتا ہے کہ ـــ لفظ اُمّ ہے۔ لفظ ام عربی زبان میں متعدد معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک مشہور و معروف معنی وہ ہیں جو اُم کے نام سے معروف ہیں۔ یعنی ماں یا اصل۔ جس طرح ماں ایک خاندان کی اصل ہوتی ہے۔ جس طرح ماں سے خاندان کا آغاز ہوتا ہے۔ اسی طرح امہ اس جماعت کو کہتے ہیں جس کا آغاز اور اصل ایک ہو۔ جو اسی طرح اپنا تشخص اور اجتماعی انفرادیت رکھتی جو ایک ماں کی اولاد میں ہوتی ہے۔ یہ بات ام کے مادہ ہی سے بالکل واضح ہے۔

اُم کے دوسرے معانی کسی چیز کا ارادہ یا قصد کرنے کے بھی ہیں۔ اَمَّ یَوُمُّ کے معنی ہیں: کسی جہت کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ارادہ کر کے اس جہت کی طرف سفر کرنا۔ یہ مفہوم بھی عربی زبان میں اُمّ کے معانی میں شامل ہے۔ عربی زبان میں فُعلہ کا ایک وزن کثرت سے آتا ہے جس میں خاص اور مشترک مفہوم یہ ہے کہ کوئی فعل اس طرف رخ کر کے انجام دیا جائے۔ مثال کے طور پر رُحلہ مشہور صفت ہے جو بعض محدثین کے ناموں میں بھی استعمال ہوتی ہے۔ رُحلہ سے مراد وہ محدث ہے جس کی طرف بڑی تعداد میں لوگ سفر کر کے جاتے ہوں۔ امام نسائی جو صحاح ستہ میں سے ایک کتاب کے مصنف ہیں ان کا لقب ہی تھا رُحلہ، جوان کے نام کے ساتھ لکھا جاتا تھا۔ اس لیے کہ دنیا کے ہر گوشے سے لوگ سفر کر کے ان کی طرف آیا کرتے تھے۔ اسی طرح اُمہ سے مراد وہ مرکز یا وہ جگہ ہے جس کا قصد کر کے بہت سے لوگ آ رہے ہوں۔ جس کی طرف بہت سے لوگ ارادہ کر کے سفر کرتے ہوں۔ گویا امہ میں مرکزیت، جاذبیت اور جامعیت کے معانی اور مفاہیم بھی موجود ہیں۔ ایسی جماعت یا ایسا گروہ جو پوری انسانیت کے لیے مرکز، قبلہ اور مقناطیس کی حیثیت رکھتی ہو، جس کی طرف لوگ رجوع کرتے ہوں۔ جس کی طرح لوگ ہدایت اور رہنمائی کے لیے رجوع کرتے ہوں اس کو بھی اُمّہ کہا جاتا ہے۔

اَمَّ یَــؤُمُّ کے تیسرے معنی عربی زبان میں کسی دین یا عقیدے پر کار بند رہنے کے بھی ہیں۔ عربی زبان کا ایک شاعر لفظ امہ کو اسی مفہوم میں استعمال کرتا ہے هَـلْ يَسْتَوِی ذُوْ اُمَّةٍ وَّكُفُوْرُ (کیا مسلمان اور کافر برابر ہو سکتے ہیں)۔

ان سب مفاہیم اور استعمالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ امہ کے لغوی معنی میں وہ سارے مفاہیم موجود ہیں جو دراصل امت مسلمہ کے خصائص کو بیان کرتے ہیں۔ امت مسلمہ ضروری نہیں کہ تعداد میں بہت زیادہ ہو۔ تعداد میں کمی بیشی امت مسلمہ کے وجود پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ اگر ایک فرد بھی ایسا ہو جوان صفات سے متصف اور ان خصوصیات کا حامل ہو تو وہ بھی تن تنہا ایک امت قرار دیا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ کو امت کہا گیا ہے۔ اِنَّ ابـراهيم كـان امة قـانتاً لِلّٰهِ حَنِيْفًا۔ ابراہیم تن تنہا ایک امت تھے۔ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے، جو اللہ کے حضور تن تنہا کھڑے ہو گئے۔ بعض مفسرین نے یہاں اُمہ کو خاص طور پر رُحلہ کے معنی میں لیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام وہ شخصیت تھے جن کی طرف لوگ ہدایت کے لیے رجوع کیا کرتے تھے۔ لیکن یہاں امت کا جو مفہوم بھی ہو، یہ بات واضح ہے کہ حضرت ابراہیمؑ تن تنہا ایک امت تھے۔ بعد میں لوگ آتے گئے اور قافلہ بنتا گیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ بات متعدد احادیث سے ثابت ہے، کہ حضور علیہ السلام نے کم ازکم دو افراد کے بارے میں امت کی اصطلاح استعمال فرمائی ہے، جن میں سے ایک سیدنا عمر فاروقؓ کے چچا تھے جو اسلام سے بہت پہلے بت پرستی اور شرک سے بیزاری کا اظہار کر چکے تھے، انہوں نے مکارم اخلاق کی تعلیم دی، اور کفارِ عرب میں موجود برے اخلاق و کردار سے اظہار برأت کیا۔ وہ زندگی بھر ملت ابراہیمی کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ مشرکین مکہ نے ان پر مظالم ڈھائے اور وہ گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ اسلام سے پہلے بے بسی اور مسافرت کے عالم میں ان کا انتقال ہو گیا۔ جب اسلام آیا اور سیدنا عمر فاروقؓ نے حضور علیہ السلام کے دستِ مبارک پر بیعت کی تو آپ نے ایک روز حضور علیہ السلام سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح کی باتیں آپ ارشاد فرماتے ہیں اور جو تعلیم آپ دیتے ہیں میرے چچا بھی اسی طرح باتیں کیا کرتے تھے۔ میرے چچا کا انجام روزِ قیامت کیا ہوگا۔ آپ نے فرمایا "یُبعث امۃً وَحْدَہٗ" ان کو تن تنہا ایک امت کے طور پر اٹھایا جائے گا۔ یہی چچا زید بن عمر بن نفیل تھے جن کے صاحبزادے حضرت سعید بن زید عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔

اسی لفظ اُمّ سے لفظ اُمّی بھی نکلا ہے جو حضور پاک کی صفت کے طور پر قرآن پاک میں کئی جگہ استعمال ہوا ہے۔ النبی الامّی اور اہل مکہ کے لیے امّیین کی اصطلاح بھی قرآن پاک میں آئی ہے۔ امّیین سے کیا مراد ہے۔ اس کے بارے میں مفسرین نے بہت سی باتیں لکھی ہیں، ان سب میں کوئی تعارض نہیں ہے، اور وہ سب بیک وقت بھی درست ہو سکتی ہیں۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ امّیین سے مراد وہ گروہ یا جماعت ہے جس نے باقاعدہ تعلیم نہ پائی ہو۔ چونکہ عرب میں بڑی تعداد میں غیر تعلیم یافتہ لوگ تھے اس لیے وہ امّیین کہلائے۔ کچھ مفسرین کا خیال ہے کہ امّیین سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا تعلق اُمّ القریٰ سے ہے۔ قرآن مجید میں مکہ مکرمہ کو اُمّ القریٰ (بستیوں کا مرکز) کہا گیا ہے اور اسلام سے پہلے بھی مکہ مکرمہ اُمّ القریٰ کے نام سے مشہور تھا۔ کچھ مفسرین کا خیال ہے کہ اُمّی سے مراد وہ شخص ہے جو اصل فطرتِ انسانی پر قائم ہو اور مختلف انسان ساختہ تصورات و نظریات نے اس کو متاثر نہ کیا ہو۔ جو اصل اور فطرت سے قریب تر ہو۔

یہ سارے معانی امت مسلمہ پر منطبق ہوتے ہیں۔ امت مسلمہ ایک ایسا گروہ ہے جو نظری اعتبار سے ایک مرکز پر کاربند ہے، اور عملاً بھی اس کو ایک ہی مرکز پر کاربند ہونا چاہیے، جس کی اصل اور آغاز ایک ہے۔ جس کے مستقبل کے اہداف اور مقاصد ایک ہیں اور جس کے درمیان اسی طرح کی وحدت اور یکجہتی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہونی چاہیے جس طرح کی وحدت اور یکجہتی ایک ماں کی اولاد میں ہوتی ہے۔ یہ امت کسی جغرافیائی حد کی پابند نہیں ہے۔ یہ کسی لسانی اور نسلی گروہ تک محدود نہیں ہے، اس کا تعلق کسی خاص جغرافیائی علاقے سے نہیں ہے، بلکہ یہ بنی آدم کے ہر گروہ اور ہر طبقے تک پھیلی ہوئی ہے۔

امت یا اُمتِ مسلمہ کا لفظ قرآن پاک میں اور احادیث میں کئی جگہ استعمال ہوا ہے۔ اور جہاں بھی استعمال ہوا ہے وہاں امت کی وحدت، امت کے مقاصد اور امت کے اہداف کو بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر بیان فرمایا گیا ہے۔ یہ بات کہ امت مسلمہ ایک وحدت ہے اور ایک نا قابل انقسام اکائی ہے قرآن مجید میں بار بار مختلف الفاظ، مختلف انداز اور مختلف سورتوں میں بیان ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ یہ مضمون مکی سورتوں میں بھی بیان ہوا ہے جبکہ ابھی مسلمانوں کے پاس اپنا کوئی مستقل مرکز اور اپنی کوئی ریاست بھی موجود نہیں تھی۔ سورۃ انبیاء مکی سورت ہے۔ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی، لیکن اس میں امت کے امۃ واحدہ ہونے کا ذکر ہے۔ وَ اِنَّ ھٰذہٖ امتکم امۃ واحدۃ۔ سورہ مؤمنون مکی سورتوں میں سے ہے۔ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ ابھی ریاست موجود نہیں تھی۔ ابھی شہریت کے تصورات سامنے نہیں آئے تھے۔ لیکن امت مسلمہ کا وجود قرآن پاک کی اس سورت میں بھی واضح کیا گیا اور امت کی وحدت کو نمایاں کیا گیا۔

ان مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امت مسلمہ ایک ایسی وحدت ہے جس کی اساس روحانی ہے، جس کی بنیاد قرآن مجید اور شریعت پر ایمان ہے، جس کی بنیاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستگی پر ہے۔ حضور علیہ السلام کے دامن سے وابستگی ہی امت مسلمہ کی بقاء کی ضامن ہے۔ اسی لیے قرآن مجید میں ازواج مطہرات کو امہات المومنین کہا گیا ہے۔ وازواجه اُمَّهَاتُهُمْ اور اس کی تفسیر میں بعض صحابہ سے یہ جملہ بھی منقول ہے: "وھو ابٌ لھم" اور پیغمبر اسلام تمہارے روحانی باپ ہیں۔ اگر پیغمبر اسلام مسلمانوں کے روحانی باپ ہیں، اور آپؐ کے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تو خود قرآن مجید نے مسلمانوں کا باپ قرار دیا ہے۔ "ملة ابیکم ابراھیم" اور آپ کی ازواج مطہرات مسلمانوں کی مائیں ہیں، تو جس طرح ایک ماں کی اولاد کو متحد اور یکجہت ہونا چاہیے اسی طرح امت مسلمہ کی وحدت و یکجہتی قرآن پاک کی نصِ قطعی سے ثابت ہے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ امت مسلمہ سے وابستگی اور چیز ہے، اور اسلامی ریاست کی شہریت دوسری چیز ہے۔ امت سے وابستگی کا کوئی تعلق کسی ریاست کی شہریت کی ذمہ داریوں یا فرائض سے نہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شہریت کی ذمہ داریاں جو ریاست کے شہری کی حیثیت سے کسی فرد کی ذمہ داریاں ہوتی ہیں وہ اپنی جگہ مستقل بالذات شریعت کا حکم ہے۔ شریعت اسلامی نے مسلمان شہریوں اور غیر مسلم شہریوں کی ملی ذمہ داریوں میں فرق کیا ہے اور ان دونوں کو ایک ریاست کے شہری ہونے اور شہریت کے حقوق وفرائض میں یکساں ہونے کے باوجود دینی اور تہذیبی اعتبار سے دو الگ الگ امتیں قرار دیا ہے۔

بعض حضرات میثاق مدینہ کی بعض دفعات سے یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ سے ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں ایک ایسی ریاست قائم کی جس میں مختلف مذاہب کے ماننے والے ایک مشترک جغرافیائی امت کی تشکیل کر رہے تھے۔ یہ اسلام کی صحیح فہم نہیں ہے۔ اور یہ میثاق مدینہ کی انتہائی غلط تعبیر ہے۔ میثاق مدینہ میں امت مسلمہ اور ریاست مدینہ کی شہریت کے بارہ میں دو الگ الگ جملے یا دفعات ہیں۔ جن میں ایک دفعہ میں امت مسلمہ کا تذکرہ ہے اور دوسری دفعہ میں غیر مسلموں کو مسلمانوں سے الگ جداگانہ امت قرار دیا گیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے کہ وہ تمام اہل ایمان مہاجرین اور انصار جو قرآن پر ایمان لائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی تسلیم کیا وہ ایک الگ امت ہیں۔ ان کے بارے میں فرمایا کہ "هم امة واحدةٍ من دون الناس" وہ تمام انسانوں سے الگ ایک متحد امت ہیں۔ من دون النّاس کا ترجمہ اس کے علاوہ نہیں ہوسکتا کہ وہ تمام انسانوں سے الگ (to the exclusion of all humanity) ایک امت ہیں۔ اس کے بعد کی دفعات میں جہاں یہودیوں کا ذکر ہے، وہاں ارشاد ہے کہ وہ یہودی جو فلاں فلاں قبائل سے تعلق رکھتے ہیں جنہوں نے اس میثاق میں حصہ لیا ہے اور مسلمانوں کی پیروی کا وعدہ کیا ہے ومن تبعهم من يهود بني عوف هم امة مع المؤمنين وہ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ایک (الگ) امت ہیں، یعنی They shall constitute an Ummah alongwith the Muslims۔ مع المومنين اور من دون الناس یہ دو الفاظ، جن میں زمین آسمان کا فرق ہے، بڑے اہم ہیں۔ ان سے اس حقیقت کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ جو امت مسلمہ مدینہ منورہ میں قائم ہوئی تھی وہ صرف اہل ایمان پر مبنی تھی اور اس کا تعلق کسی مذہبی کثیر العناصر قومی تشکیل یا نیشنلسٹ تحریک سے نہیں تھا، بلکہ وہ صرف قرآن مجید کی اساس اور ایمان پر قائم کی گئی تھی۔

امت سے ملتا جلتا ایک لفظ قرآن پاک میں اور اسلامی ادبیات میں کثرت سے استعمال ہوا ہے وہ ملت کا لفظ ہے۔ ملة ابيكم ابراهيم۔ امت اور ملت میں تھوڑا سا فرق ہے۔ اگرچہ اردو، فارسی اور ترکی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زبانوں میں ملت کا لفظ امت ہی کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے، لیکن ملت سے مراد امت مسلمہ کا ثقافتی کردار ہے۔ قرآن مجید میں ملت کی اصطلاح جہاں جہاں استعمال ہوئی ہے وہاں امت مسلمہ کے تہذیبی مظاہر اور ثقافتی مظاہر اور شعائرِ اسلام کے لیے استعمال ہوئی ہے۔ ان سب پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے ان سب چیزوں کے لیے ملت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے یہ پیغام دینا مقصود ہے کہ یہ امت اپنے شعائر میں، اپنی ثقافت میں، اپنی تہذیب میں بقیہ تمام امتوں سے الگ اور ممتاز تشخص کی مالک ہے۔

یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملت کی نسبت کرنے کے چار بڑے اسباب ہیں۔ ایک بڑا سبب تو یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس طرح رنگ اور نسل سے اظہارِ برأت فرمایا، اس سے امت مسلمہ کی عالمگیریت اور بین الانسانیت کا اظہار ہوتا ہے۔ اگر رنگ اور نسل کو نظریہ کی اساس قرار دیا جائے اور رنگ اور نسل کی بنیاد پر کوئی اجتماعیت قائم کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ اجتماعیت کبھی بھی امت مسلمہ کی بین الانسانیت سے ہم آہنگ نہیں ہوسکتی۔ اس لیے امت مسلمہ کی بین الانسانیت کا تقاضا ہے، اور اس کا منطقی نتیجہ اور تہذیبی مطالبہ ہے کہ رنگ اور نسل سے اظہار برأت کیا جائے۔

دوسری بڑی خصوصیت ملت ابراہیمی کی عالمگیریت ہے جو رنگ و نسل سے اظہارت برأت ہی کے نتیجے میں وجود میں آسکتی ہے۔

تیسری اور چوتھی بڑی خصوصیت ہجرت اور بین الاقوامیت ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام وہ پہلے پیغمبر ہیں جنھوں نے ایک براعظم سے دوسرے براعظم اور دوسرے براعظم سے تیسرے براعظم ہجرت فرمائی اور ایک طرح سے بین البراعظمی دینی دعوت کا آغاز کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے بین البراعظمی دینی دعوتوں کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ چونکہ قرآن مجید کی لائی ہوئی دعوت کو بین البراعظمی بننا تھا اور اسی طرح عالمگیر اور بین الانسانی بننا تھا جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت تھی۔ اس لیے ملت اسلامیہ کو ملت ابراہیمی قرار دیا گیا۔ پھر ملت ابراہیمی کا مرکزِ حسی علامہ اقبال کے الفاظ میں چونکہ بیت اللہ تھا اور اسی کو تا قیامِ قیامت ملت مسلمہ کا مرکز حسّی بنایا جانا تھا اسی لیے اس مرکز حسّی کے بانی کے نام پر اس ملت کو ملت ابراہیمی قرار دیا گیا۔

اُمت کے لفظ کے ساتھ ساتھ دو اصطلاحات اور بھی ہیں جو قرآن مجید میں اور اسلامی ادبیات میں بارہا استعمال ہوئی ہیں جن کا اشتقاق ایک ہی مادہ اور ایک ہی مصدر سے ہوا ہے۔ ان میں سے ایک امام کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اصطلاح ہے۔ اگر امت ہوگی تو اس کے لیے امام بھی ہوگا۔ امام سے مراد محض دو رکعت کا امام نہیں، بلکہ امام سے مراد وہ قائد اور وہ رہنما ہے جو امت مسلمہ کو اس کے مقاصد اور اہداف کی تکمیل کے معاملے میں رہنمائی فراہم کر سکے۔ قرآن مجید میں امام کا لفظ متعدد معانی میں استعمال ہوا ہے اور یہ سارے معانی امت مسلمہ کی امامت کے لیے ناگزیر ہیں۔ ایک معنی تو امام کے قائد اور رہنما ہونے کے ہیں، جس اعتبار سے مسلمانوں کے قائد اور رہنما کو امام ہونا چاہیے۔

دوسرا مفہوم امام کی اصطلاح کا وہ واضح اور کشادہ راستہ ہے جس پر چلنے میں کسی مسافر کو دقت یا مشکل پیش نہ آئے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ اس راستے کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے "وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ" (سورۃ الحجر: ۷۹)۔ فلاں اور فلاں بستیاں ایک واضح اور کشادہ راستہ پر موجود تھیں۔ کشادہ شاہراہ پر واقع تھیں۔

تیسرے معنی امام کے اس کتاب ہدایت کے بھی ہیں جس کی روشنی میں انسان اپنا سفر طے کر سکے۔ اور اپنی زندگی کے مسائل اور مشکلات کو حل کر سکے۔ قرآن مجید میں نہ صرف قرآن مجید کو بلکہ پہلی آسمانی کتابوں کو بھی امام کی اصطلاح سے یاد کیا گیا ہے۔ "وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّ رَحْمَةً" جس طرح یہ کتاب امام کی حیثیت رکھتی ہے اسی طرح اس سے قبل حضرت موسیٰ کی کتاب بھی امام اور رحمت کی حیثیت رکھتی تھی۔ لہٰذا امت مسلمہ کے جو قائدین ہوں ان کو قیادت کے تقاضوں اور ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ اس کتاب ہدایت کا علم بھی ہونا چاہیے۔ ان کو اس واضح راستے کا علم بھی ہونا چاہیے جس پر چل کر وہ امت مسلمہ کی قیادت کر رہے ہیں اور کرنا چاہتے ہیں۔

جہاں تک امت مسلمہ کے خصائص کا تعلق ہے، قرآن مجید نے جا بجا ان خصائص کو بیان کیا ہے۔ ان میں سب سے پہلی خصوصیت تو وحدت اور یکجہتی ہے، امت مسلمہ اگر ایک امت نہیں ہے تو وہ ان میں سے کسی ایک مفہوم میں ناقص ہے: یا تو وہ ایک روحانی باپ کی اولاد نہیں ہے، یا وہ اپنے مشترکہ اہداف و مقاصد پر کما حقہ ایمان نہیں رکھتی، یا ان مقاصد و اہداف پر چلنے کا راستہ اس کے سامنے واضح نہیں ہے، یا وہ کتاب ہدایت اس کے سامنے نہیں ہے جس پر چل کر وہ امت مسلمہ ہونے کے تقاضوں کو پورا کر سکتی ہے، یا اس کا قائد اور امام اس کا اہل نہیں ہے کہ اس کی قیادت کر سکے۔ جب بھی ان میں سے کوئی ایک یا چند خرابیاں پیدا ہوں گی تو امت مسلمہ کی وحدت پر فرق پڑے گا۔ امت مسلمہ کی وحدت اسی وقت قائم رہ سکتی ہے جب امت اس واضح راستے پر کاربند ہو جسے "امام مبین" کہا جاسکتا ہے اور اس کے وہ قائدین ہوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جن کے بارے میں کل گفتگو ہوگی، جن کے فرائض وخصائص قرآن مجید نے بیان کیے ہیں۔

دوسری خصوصیت امت مسلمہ کی عالمگیریت بتائی گئی تھی۔ عالمگیریت سے مراد یہ ہے کہ امت مسلمہ ایک ایسے بین الانسانی پیغام کی علمبردار ہو اور رہے، جس کا تعلق کسی خاص جغرافیے، نسل، یا کسی خاص خطے سے نہ ہو۔ اگر اس کا تعلق کسی نسل، جغرافیہ، رنگ یا خطے سے ہے تو پھر امت مسلمہ کی عالمگیریت متاثر ہوتی ہے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جب کوئی ان کا نام ونسب پوچھتا تھا تو وہ سلمان بن اسلام بتایا کرتے تھے۔

امت مسلمہ کی تیسری خصوصیت جو قرآن پاک میں بیان ہوئی ہے وہ اس کا ایک روحانی (بمقابلہ مادی) امت ہونا ہے، اس امت کی اصل اساس اور قوت محرکہ روحانی (بمقابلہ مادی) ہے۔ اس کا نقطۂ جامعہ ایک روحانی عقیدہ ہے۔ انسانوں کو ایک اساس پر متحد کرنے کی کوشش والے وسائل واسباب جو ماضی میں کارفرما رہے، وہ رنگ، نسل، زبان اور اشتراک وطن کے عوامل ہیں۔ یہ وہ مختلف چیزیں ہیں جو انسانوں کے اپنے اختیار میں نہیں ہوتیں۔ کوئی انسان اپنا رنگ خود متعین نہیں کرتا، کوئی انسان اپنا نسلی گروپ خود متعین نہیں کرتا، کوئی انسان خود ارادہ کر کے کسی نسل میں پیدا نہیں ہوتا۔ ہم میں سے کوئی یہ طے کر کے پیدا نہیں ہوا تھا کہ ہمیں کس ماں باپ کے گھر، کس نسل میں اور کہاں پیدا ہونا ہے؟ یہ سب امور اللہ تعالیٰ طے کر کے بھیجتا ہے، لہٰذا ایسے عوامل اور اسباب جو ہمارے کنٹرول میں نہ ہوں، ان کی بنیاد پر اجتماعیت قائم کی جائے گی تو یہ ایک بہت کمزور اور غیر حقیقی اساس ثابت ہوگی۔ اسی لیے یہ بات قرآن پاک میں پسند نہیں کی گئی۔ یہ اساس انسانوں کے باہمی تعارف کا ذریعہ تو ہوسکتی ہے لیکن اجتماعیت کی اساس نہیں ہوسکتی۔ اجتماعیت کی اساس وہ چیز ہوسکتی ہے جو انسانوں نے اپنے شعور سے اور اپنی آزادانہ مرضی سے اپنے لیے خود اختیار کی ہو، وہ انسان کی رائے اور عقیدہ ہی ہوسکتا ہے۔

اس لیے اجتماعیت کی اساس انسان کی رائے اور عقیدہ ہی کو ہونا چاہیے۔ ویسے بھی دنیا کے ہر ا میں انسانوں کو صرف انہی فیصلوں کی بنیاد پر مکلّف اور ذمہ دار مانا جاتا ہے جو انسانوں نے آپنی رضامندی سے اور اپنے اختیار سے کیے ہوں، جو بات کسی انسان سے بغیر ارادے کے سرزد ہوگئی ہو اس بات کی وجہ سے کسی کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جاتا۔ غلطی سے کسی کے ہاتھ سے کوئی چیز گر گئی اور دوسرے شخص کے چوٹ لگ گئی، یہ دنیا کے کسی بھی نظام کی رو سے کوئی جرم نہیں ہے۔ دنیا کا ہر قانون اس شخص کو بری الذمہ دار قرار دیتا ہے۔ ایسے شخص پر کوئی فوجداری ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ فوجداری ذمہ داری یا دیوانی ذمہ داری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہیں عائد ہوتی ہے جہاں کسی انسان نے شعوری طور پر کوئی فیصلہ کیا ہو، اور اس کے نتیجے میں کسی کا حق متاثر ہوا ہو۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ دنیا کے بہت سے انسانوں نے اجتماعیت کے بڑے بڑے فیصلے، انسانوں کے مستقبل کے بارے میں بڑے بڑے فیصلے ان اسباب کے نتیجے میں کیے ہیں جو ان میں سے کسی کے بھی اختیار میں نہیں ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے روحانیت اور عقیدے پر مبنی ایک ایسی اجتماعیت کی دعوت دی ہے جو درحقیقت بین الانسانی اجتماعیت ہے۔ قرآن مجید نے بقیہ تمام اجتماعیتوں کے بنیاد ہونے کی نفی کی ہے اور ان کو صرف باہمی تعارف کا ذریعہ قرار دیا ہے۔

امت کی چوتھی بڑی خصوصیت افراد امت کے درمیان مساوات ہے۔ قرآن مجید نے مسلمانوں کو ایک دوسرے کا بھائی قرار دیا ہے۔ ''انما المؤمنون اِخوۃ'' اور اگر مسلمان بھائی بھائی ہیں تو مساوات اس کا لازمی تقاضا ہے۔ اس لیے مساوات اور اخوت دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ اخوت تو موجود ہو اور مساوات موجود نہ ہو۔

بہنوں کی دلچسپی کے لیے عرض کرتا ہوں کہ شاید دنیا کی کسی اور زبان میں یہ خصوصیت موجود نہیں ہے جو عربی زبان میں ہے کہ بھائی اور بہن کے لیے عربی زبان میں ایک ہی لفظ ہے ''اُخ''۔ اس میں تانیث کی 'ت' لگا دیں تو ''اخت'' ہو جاتا ہے۔ جو بہن کے معنی میں آتا ہے اور تانیث کی ''ت'' ہٹا دیں تو ''اُخ'' رہ جاتا ہے جو بھائی کے معنی میں آتا ہے۔ دونوں سے ایک ہی مصدر اخوت بنتا ہے۔ اردو میں اخوت کا ترجمہ اگر بھائی چارہ کیا جائے گا تو بہنیں نکل جائیں گی، بہنوں کو مجازاً اور ضمناً شامل کرنا پڑے گا۔ بہناپا ترجمہ کیا جائے گا تو بھائی نکل جائیں گے۔ brotherhood ترجمہ کیا جائے گا تو sisterhood شامل نہیں ہوگی۔ اسی طرح سے بیشتر زبانوں میں اخوت کا جو بھی ترجمہ کیا جائے گا تو کسی ایک صنف کو مجازاً شامل کرنا پڑے گا، جبکہ عربی زبان کی اصطلاح اخوت میں بہن اور بھائی دونوں حقیقی طور پر شامل ہیں، کسی کو محض مجازی طور پر شامل نہیں کیا گیا۔

امت مسلمہ کی پانچویں خصوصیت عدل ہے۔ عدل کے بارے میں کل میں نے عرض کیا تھا کہ اسلامی شریعت کے دو بنیادی اصول اور اہم ترین قواعد علم اور عدل ہیں۔ عدل کے بارے میں قرآن پاک میں اتنی تفصیل سے ہدایات دی گئی ہیں کہ اگر ان کو یکجا کیا جائے تو قرآن کے تصور عدل پر ایک مستقل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بالذات کتاب تیار ہوسکتی ہے۔ یوں تو عدل کا دعویٰ تمام مذاہب اور نظریات و قوانین کرتے آئے ہیں، لیکن عدل کے ایسے نازک پہلو جو عموماً انسانوں کی نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں وہ قرآن مجید نے بیان فرمائے ہیں۔ عام طور پر عدل کا تقاضا اس وقت بہت نازک ہوتا ہے جب عدل کرنے والا اپنے کسی قریبی انسان یا خود اپنے حق میں فیصلہ کر رہا ہو۔ غیر کے مقابلے میں یا دو اجنبی اور دو غیر انسانوں کے درمیان عدل کرنا تو کوئی زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ آپ نہ زید کو جانتے ہیں نہ عمرو کو جانتے ہیں۔ دونوں آپ کے سامنے آئے ہیں۔ آپ غیر جانبداری سے ان میں سے کسی ایک کے حق میں آسانی سے فیصلہ کر دیں گے۔ لیکن جہاں ایک آپ کا قریبی عزیز ہو، بھائی ہو، وہاں اپنے عزیز کے خلاف فیصلہ کرنا جان جوکھوں کا کام ہوتا ہے۔ جہاں کوئی دشمن ہے جس سے آپ کی پرانی مخالفت چلی آ رہی ہے، جس نے آپ کے خلاف جنگیں لڑی ہیں، جس نے آپ سے دشمنی کی ہے، جس نے آپ کے خلاف زیادتیاں کی ہیں اس کے بارے میں عدل و انصاف سے کام لینا یہ بھی بڑا مشکل کام ہے۔ قرآن مجید نے جہاں جہاں عدل کے احکام دیے ہیں وہاں ان دونوں کو یا ان دونوں میں سے کسی ایک صورت حال کے تقاضوں کو واضح طور پر یاد دلایا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوا ہے: "ولو کان ذاقربیٰ" چاہے وہ تمہارا قریبی عزیز بھی ہو۔ ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے: "ولو علیٰ انفسکم" یعنی اگر تمہاری اپنی ذات کا معاملہ بھی ہو تو بھی عدل و انصاف سے کام لینا تمہارا فریضہ منصبی ہے۔ ایک اور جگہ فرمایا: "وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شنئان قومٍ علیٰ اَلَّا تَعْدِلُوْا" کسی قوم کی دشمنی تم کو ہرگز اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل و انصاف سے کام نہ لو۔

عدل کے بعد چھٹی خصوصیت علم ہے جس پر پوری امت مسلمہ کی اساس ہے۔ ابھی میں عرض کرتا ہوں کہ حصول علم امت مسلمہ کی اجتماعی ذمہ داری ہے۔ کل میں نے فرائض کفایہ اور فرائض عین کا تذکرہ کیا تھا۔ علم کا حصول امت مسلمہ کے ہر فرد کے ذمہ ایک سطح پر فرض عین ہے اور ایک دوسری سطح پر فرض کفایہ ہے۔ فرض کفایہ سے مراد وہ فرائض ہیں جو پوری امت مسلمہ پر اجتماعی طور پر عائد ہوتے ہیں۔ فرائض کفایہ کی تعریف میں فقہائے اسلام نے لکھا ہے کہ وہ تمام فرائض جو امت مسلمہ پر اجتماعی طور پر عائد ہوتے ہوں اور ان کی نیابت کے طور پر ایک گروہ ان کو انجام دے دے تو اگر ان فرائض کو مؤثر اور کافی طریقے سے انجام دے دیا جائے اور مطلوبہ سطح پر ان کے تقاضے پورے کر دیے جائیں تو پوری امت مسلمہ بری الذمہ ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر مطلوبہ سطح پر مناسب اور موزوں انداز میں ان کو انجام نہ دیا جائے تو پوری امت مسلمہ ذمہ دار ہوتی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان اجتماعی فرائض میں سے علم کا حصول بھی ہے۔ پہلے میں عرض کر چکا ہوں کہ یہاں علم سے مراد صرف علم دین نہیں ہے، بلکہ ان تمام دنیوی معاملات کا علم بھی شامل ہے جو مسلمانوں کو آزادی، خود مختاری اور استقلال عطا کرنے کے لیے ناگزیر ہیں۔ یہ علوم وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے رہے ہیں اور آئندہ بھی بدلتے جائیں گے۔ ایک زمانہ تھا کہ علم کا دائرہ محدود تھا۔ فن اور ٹیکنالوجی کا دائرہ محدود تھا، لیکن اس دور میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی براہ راست سرپرستی میں فنی اور تکنیکی مہارتوں کو حاصل کیا گیا۔ بعد میں صحابہ کرامؓ کا طرزِ عمل بھی یہی رہا کہ انہوں نے غیر مسلموں سے بھی مطلوبہ علوم وفنون کو سیکھنے میں تامل نہیں کیا۔ فتح مکہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف کی فتح کا ارادہ فرمایا۔ طائف ایک قلعہ بند شہر تھا جس کے گرد مضبوط فصیل صدیوں پہلے تعمیر ہوئی تھی۔ اس شہر کے خلاف حملہ کرنے کے لیے منجنیق کا استعمال ناگزیر تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو یمن بھیجا۔ وہ وہاں سے منجنیق خرید کر لائے اس کو چلانے اور بنانے کا طریقہ بھی سیکھ کر آئے۔ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف کی فتح میں منجنیق کو استعمال فرمایا۔ منجنیق کو آج کل کے ٹینک یا توپ کا پیش رو کہہ سکتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ضرورت محسوس ہوئی کہ غیر مسلم قبائل سے خط وکتابت کرنے کے لیے ان کی زبان سیکھی جائے تو حضرت زید بن ثابتؓ کو آپ نے یہودیوں کے مدارس میں بھیجا اور انہوں نے وہاں عبرانی زبان کی تعلیم حاصل کی تاکہ ریاست اسلامی کے صیغہ امور خارجہ کو انجام دے سکیں۔

ان دونوں مثالوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خالص فنی اور دنیوی معاملات میں بھی حصول علم فرض کفایہ کی حیثیت رکھتا ہے اور غیر مسلموں سے اس کو حاصل کرنا جہاں ناگزیر ہو وہاں اس کا حصول صحابہ کرام اور تابعین کی سنت ہے۔

امت مسلمہ کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ ''بِرّ'' پر قائم ہے۔ ''بِرّ'' قرآن مجید کی ایک جامع اصطلاح ہے جس کا ترجمہ زبان کی تنگ دامانی کی وجہ سے اُردو میں مترجمین نے نیکی کر دیا ہے۔ بِرّ میں نیکی بھی شامل ہے لیکن بِرّ ایک بہت وسیع اور ہمہ گیر قرآنی اصطلاح ہے جس میں وہ تمام انسانی اور اخلاقی پہلو شامل ہیں جن پر انسانوں کی کامیاب زندگی کا دارومدار ہے۔

آج دنیا رواداری کا پرچم بلند کرنا چاہتی ہے جو Tolerance کا ترجمہ ہے۔ Tolerance رواداری کیا ہے، رواداری اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ آپ اس گروہ کو جو آپ سے الگ ہو برداشت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کریں۔ غیر کو برداشت کرنے کا نام رواداری یا Tolerance ہے اور اسی کا ترجمہ اُردو میں رواداری کیا جاتا ہے۔ رواداری کے لفظ میں یہ مفہوم شامل ہے کہ آپ غیر کو ناپسند کرتے ہیں، آپ نہیں چاہتے کہ وہ آپ کے ساتھ رہے۔ لیکن آپ مجبوراً اس کو برداشت کرتے ہیں، اس کو گویا tolerate کرتے ہیں۔ قرآن مجید نے ایسا کوئی لفظ استعمال نہیں کیا جس کا کوئی منفی مفہوم نکلتا ہو یا جس میں کوئی negative nuance پایا جاتا ہو۔ قرآن مجید نے اس کے لیے بِرّ کی اصطلاح استعمال کی ہے جس میں وہ تمام مکارمِ اخلاق شامل ہیں جو انسانوں اور انسانوں کے درمیان پائے جانے چاہییں۔ لَا یَنۡهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیۡنَ لَمۡ یُقٰتِلُوۡكُمۡ فِی الدِّیۡنِ وَلَمۡ یُخۡرِجُوۡكُمۡ مِّنۡ دِیَارِكُمۡ اَنۡ تَبَرُّوۡهُمۡ وَتُقۡسِطُوۡۤا اِلَیۡهِمۡ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الۡمُقۡسِطِیۡنَ (الممتحنة ۸:) جن لوگوں نے تمھارے ساتھ دشمنی نہیں کی، جن غیر مسلموں نے تمھیں تمھارے گھروں سے نہیں نکالا، جن غیر مسلموں نے تمھارے خلاف جنگ نہیں لڑی، ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ تمھیں ہدایت دیتا ہے، تمھیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان کے ساتھ بِرّ کا رویہ اختیار کرو۔ اور ان کے ساتھ حقیقی انصاف سے کام لو۔

قرآن مجید میں عدل اور قسط دو اصطلاحات الگ الگ استعمال ہوئی ہیں۔ دونوں کا ترجمہ انصاف یا جسٹس کر دیا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ دونوں ایک ہی مفہوم کی حامل اصطلاحات ہیں، یا ان کا مفہوم الگ الگ ہے۔ مفسرینِ قرآن کے درمیان اس باب میں طویل بحث ہوتی رہی ہے کہ کیا قرآن مجید میں مترادفات استعمال ہوئے ہیں۔ کچھ حضرات کا خیال ہے کہ قرآن میں مترادفات استعمل ہوئے ہیں، کچھ کا خیال ہے کہ نہیں ہوئے۔ جن کا خیال ہے قرآن مجید میں مترادفات استعمال ہوئے ہیں ان کا خیال یہ ہے کہ مترادف کا استعمال تاکید کے لیے ہوتا ہے۔ جن کا خیال ہے کہ مترادفات قرآن میں استعمال نہیں ہوئے ان کا کہنا ہے کہ اگر دو لفظوں کا ایک ہی مفہوم ہے تو ایک لفظ زائد ہوا اور قرآن پاک میں کوئی چیز زائد از ضرورت اور فالتو نہیں۔ اس لیے قرآن مجید میں مترادفات استعمال نہیں ہوئے۔

یہ بحث تابعین کے زمانے میں شروع ہوئی اور بالآخر ایک ایسے اصول پر منتج ہوئی جس میں ان دونوں نقطہ ہائے نظر کو سمو دیا گیا۔ وہ اصول یہ تھا کہ ''اِذَا اجۡتَمَعَا افۡتَرَقَا وَاِذَا افۡتَرَقَا اِجۡتَمَعَا '' کہ اگر دو بظاہر مترادف الفاظ قرآن پاک میں ایک جگہ استعمال ہوں تو وہ مترادف نہیں سمجھے جائیں گے، بلکہ ان کا الگ الگ مفہوم سمجھا جائے گا۔ وَاِذَا افۡتَرَقَا اگر وہ دونوں الفاظ الگ الگ سیاق و سباق میں استعمال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوئے ہوں تو اِجتَمَعَا تو ان کا مفہوم ایک ہوگا اور ان کو ایک مفہوم میں سمجھا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اگر عدل وقسط کے الفاظ الگ الگ سیاق وسباق میں آئے ہوں تو دونوں کے معانی عدل وانصاف ہی کے ہوں گے۔ لیکن اگر کسی ایک سیاق میں دونوں الفاظ جمع ہو جائیں تو دونوں کے معانی یکساں نہیں ہوں گے۔

تھوڑا سا غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عدل کے معنی تو اس قانونی انصاف کے ہیں جو ریاست اور ریاستی ادارے انجام دیتے ہیں۔ جبکہ قسط کے معنی اس حقیقی انصاف کے ہیں جو فرد خود انجام دیتا ہے۔ ریاست کے اداروں کی ذمہ داری یہ ہے کہ قانون کے مطابق ظاہری شواہد کی بنیاد پر جو کچھ عدالت کے سامنے پیش کیا گیا ہے اس کی بنیاد پر فیصلہ دے دیں اور کسی کے دل میں اترنے یا اس کی نیت کے بارے میں حکم لگانے کا کوئی ارادہ نہ کریں۔ اس لیے کہ کسی کو کسی کے دل کی گہرائیوں میں پائے جانے والے جذبات واحساسات اور ذہن میں جنم لینے والے خیالات کی اطلاع نہیں ہوتی۔ یہ راستہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ کے لیے بند کر دیا ہے کہ دنیاوی حکمران لوگوں کے دلوں میں اترنے کا دعویٰ کریں اور لوگوں کی نیتوں کی بنیاد پر فیصلے کرنے کا اختیار اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ تاہم ہر فرد کو براہ راست ذاتی طور پر مکلف کیا گیا ہے کہ وہ چونکہ اپنے دل کا حال خود جانتا ہے اس لیے اس کو چاہیے کہ حقیقی انصاف کے جو بھی تقاضے ہوں وہ پورے کرے۔ اور جس کا جو حق بنتا ہے وہ اس کو ادا کرے۔ اس سیاق وسباق میں جب غیر مسلموں کے لیے قسط کی اصطلاح استعمال کی گئی (''تُقسِطُوا اِلَیھِم'') تو اس کے معنی یہ ہیں کہ غیر مسلم کے ساتھ حقیقی اور مکمل انصاف کا حکم شریعت نے دیا ہے۔ محض قانونی تقاضے پورا کرنے کو نہیں کہا۔ محض قانونی ضابطے پر ظاہری عمل درآمد سے وہ بات پوری نہیں ہوگی جو حقیقی انصاف کے تقاضوں کو ان کی پوری روح کے ساتھ ادا کرنے سے ہوگی۔

ایک اور خصوصیت امت مسلمہ کی یہ ہے کہ یہ ایک اخلاقی تنظیم ہے۔ یہ ایک اخلاقی ہیئت اور وہ ہیئت اجتماعیہ انسانیہ ہے جو ایک اخلاقی مقصد کی خاطر وجود میں لائی گئی۔ قرآن مجید کی بعض آیات جن میں سے کچھ کا میں ابھی تذکرہ کر چکا ہوں وہ اخلاقی ذمہ داریاں بیان کرتی ہیں کہ جو پوری امت مسلمہ کی ذمہ داریاں ہیں۔ امت مسلمہ کا اصل ہدف اخلاقی اور اساس روحانی ہے۔ اس روحانی اساس کے تحفظ اور اخلاقی ہدف کی تکمیل کے لیے بہت سے دوسرے اقدامات کی ضرورت پڑتی ہے جو اصل اہداف کے لیے وسائل اور تکملہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید نے اخوت پر بار بار زور دیا ہے اور امت مسلمہ کے افراد کو ایک دوسرے کا بھائی قرار دیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بعض مغربی مصنفین نے بغیر کسی دلیل کے یہ بات لکھ دی ہے کہ انیسویں اور بیسویں صدی کے مسلمان اہل علم جس اخوت یا مساوات پر زور دے رہے ہیں یہ اخوت و مساوات انہوں نے انقلابِ فرانس سے سیکھی ہے۔ جب اٹھارہویں صدی میں انقلاب فرانس رونما ہوا تو انقلاب فرانس کے تین نعرے بڑے مشہور تھے۔ آزادی، اخوت اور مساوات (liberty, fraternity, equality)۔ اتفاق سے یہ تینوں مفاہیم الفاظ قرآن پاک اور احادیث نبوی میں کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔ اس بات کی تو کسی نے تحقیق کی ضرورت ہی نہیں سمجھی کہ انقلابِ فرانس کے اصل مصنفین اور فکری قائدین قرآن پاک اور شریعت کی فطری تعلیم سے کتنے متاثر تھے، اور یہ تین نعرے کس حد تک قرآن پاک کی تعلیم، شریعت اور فکر اسلامی کے اثرات کا نتیجہ ہیں۔ لیکن یہ بات واضح ہے کہ انقلاب فرانس سے پچھلے سو سال کے دوران متعدد فرانسیسی مصنفین وہ تھے جو براہ راست اسلامی مآخذ سے واقف تھے اور جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ عربی زبان جانتے تھے۔ ان میں سے ایک روسو بھی ہے۔ روسو کی تحریروں میں یہ تینوں نعرے مختلف انداز میں ملتے ہیں۔ روسو کے بارے میں یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ عربی جانتا تھا۔ اور اسلامی مآخذ تک اس کی رسائی تھی۔ لیکن اس تاثر یا تاثیر کے باوجود یہ بات کہ ان کی اس مطلوبہ آزادی اور اخوت کی حدود کیا ہوں گی، یہ بات انقلابِ فرانس کے علم برداروں نے زیادہ وضاحت سے بیان نہیں کی۔

کسی نظام کے معقول اور منطقی ہونے کا اصل الاصول یہ ہے کہ اس میں آزادی اور اخوت کی حدود کا تعین کیا گیا ہو۔ مساوات کے قواعد بیان کیے گئے ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ اخوت کا اصل مفہوم اور مساوات کا اصل مدعا قرآن پاک اور اسلام نے بیان کیا ہے۔ وحدت کس انداز کی ہونی چاہیے، وحدت کی اساس اخوت اور مساوات پر کیسے ہونی چاہیے؟ یہ بات جتنی تفصیل سے مفکرین اسلام نے اور مفسرین قرآن نے بیان کی ہے اتنی تفصیل انقلاب فرانس کے مفکرین کے ہاں نہیں ملتی۔

جب ہم وحدت کی بات کرتے ہیں تو وحدت کے تین مظاہر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اگر یہ تینوں مظاہر بیک وقت موجود ہوں تو وہ حقیقی اور مطلوب وحدت ہے۔ اگر ان میں سے ایک مظہر کم ہو تو اسی حساب سے وحدت اپنے اصل معیار سے کم ہو جائے گی۔ اصل چیز وحدت افکار اور وحدت کردار ہے۔ لیکن وحدت افکار کے بغیر وحدتِ کردار مشکل ہے۔ وحدتِ افکار کے لیے ضروری ہے کہ وحدتِ گفتار بھی ہو۔ یوں پہلا مقصد یا پہلا قدم وحدتِ گفتار قرار پاتا ہے جس کے نتیجے میں وحدتِ افکار پیدا ہونی چاہیے۔ اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وحدت افکار کے نتیجے میں وحدت کردار پیدا ہونی چاہیے۔ ع وحدت افکار کی بے وحدتِ کردار ہے خام۔
یہ علامہ اقبال کی بال جبرئیل کا ایک مصرعہ ہے۔

امت مسلمہ کے خصائص کے ضمن میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ قرآن مجید نے امت مسلمہ کی دو بڑی خصوصیات بیان کی ہیں۔ جو ان تمام خصوصیات کی جامع ہیں جن کا میں نے ابھی تذکرہ کیا۔ سورۃ بقرہ میں امت مسلمہ کے قیام کا اعلان کیا گیا۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ سورۃ بقرہ امت مسلمہ کے قیام کا formal daclaration ہے۔ سورۃ بقرہ میں حضرت ابراہیمؑ کی اس دعا کا بھی ذکر ہے جس کے نتیجے میں یا جس کی برکت سے ملت مسلمہ ظاہر ہوئی، یا جس کے جواب میں ملت مسلمہ عطا ہوئی۔ سورۃ بقرہ ہی میں کئی خصائص کا ذکر ہے۔ سورۃ آل عمران میں بھی بعض خصائص کا ذکر ہے اور یہ دونوں سورتیں امت مسلمہ کے عالمگیر کردار کی وضاحت کرتی ہیں۔ سورۃ بقرہ میں کہا گیا کہ ''و کذلک جعلنکم امۃً وسطاً (ہم نے ایک ایسی امت تمہیں بنایا ہے جو درمیانے راستے پر یا بیچ کی راس پر قائم ہے)۔ بیچ کی راس پر یہ امت مسلمہ ایک مقصد کی خاطر قائم ہے اور وہ ہے: لتکونوا شھداء علی الناس (تاکہ تم انسانوں کے مقابلے میں حق کے گواہ اسی طرح بنو جس طرح سے پیغمبر تمہارے لیے حق کے گواہ ہیں) ویکون الرسول علیکم شھیدا۔ یہ بات سورہ بقرہ میں بھی کئی بار بیان ہوئی ہے۔ سورۃ آل عمران میں بھی کئی بار بیان ہوئی ہے اور ان دونوں کے علاوہ بھی کئی سورتوں میں کئی جگہ بیان ہوئی ہے۔ سورۃ آل عمران میں کہا گیا کہ تم بہترین امت ہو کُنتُم خَیرَ اُمَّۃٍ اخرجت للناس جو انسانوں کے فائدے کے لیے نکالی گئی ہے۔ یہاں اخرجت اور لام یہ دونوں لفظ بڑے اہم ہیں۔ یہ بھی کہا جا سکتا تھا کہ پیدا کی گئی ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا تھا کہ اٹھائی گئی ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا تھا کہ اللہ نے اس کو پیدا کیا ہے۔ جعل، خلق، انشأ اس طرح کا کوئی لفظ نہیں ہے۔ لیکن اخرجت للنّاس : انسانوں کے فائدہ کے لیے نکالی گئی کے الفاظ بہت معنی خیز ہیں۔ نکالے جانے میں ASSIGNMENT کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ جب آپ کسی آدمی کو کسی ذمہ داری کے لیے گھر سے نکالتے ہیں، یا خود کسی مہم کے لیے گھر سے نکلتے ہیں تو اس کے لیے نکلنے کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ جب کسی مہم کی انجام دہی کے لیے کوئی شخص گھر سے نکلتا ہے تو اس انجام دہی کے لیے نکلنے کو نکلنا کہا جاتا ہے، خروج کہا جاتا ہے۔ اس لیے قرآن مجید اس لفظ سے یہ پیغام دینا چاہتا ہے کہ امت مسلمہ ایک مہم کی خاطر نکالی گئی ہے۔ اور اس کو اس مہم کی خاطر نکلے رہنا چاہیے۔ وہ مہم کیا ہے۔ تأمرون بالمعروف و تنھون

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عن المنکر — تم اچھائی کا حکم دیتے ہو، برائی سے روکتے ہو۔ بقیہ دو کا میں ابھی تذکرہ کرتا ہوں۔

یہ جو دو بنیادی الفاظ ہیں، معروف اور منکر، یہ قرآن پاک کے بنیادی اور اصطلاحی الفاظ ہیں۔ معروف سے مراد ہر وہ اچھا کام ہے جس کو شریعتِ الٰہی نے اچھا قرار دیا ہو یا جس کو انسانوں کی فطرت سلیمہ اچھا سمجھتی ہو۔ منکر سے مراد ہر وہ برائی ہے جس کو شریعت نے برائی قرار دیا ہو یا انسانوں کی فطرت سلیمہ اس کو برائی سمجھتی ہو۔ وہ فطرتِ سلیمہ جہاں خود معروف و منکر کے تقاضوں پر عمل کرنے کی پابند ہے وہاں دوسروں کے سلسلہ میں بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عمل درآمد کی مکلف ہے۔

قرآن مجید کی سورۃ لقمان میں جہاں لقمان اپنے بیٹے کو ہدایات دے رہے ہیں وہاں یہ بات قابل غور ہے کہ ایک باپ اپنے بیٹے کو ہدایات دے رہا ہے۔ ظاہر ہے وہاں کسی اجتماعی ذمہ داری کی بات نہیں ہو رہی، وہاں کوئی اجتماعیت زیر بحث نہیں ہے۔ وہاں کوئی ریاست زیر بحث نہیں ہے۔ وہاں صرف فرد کی انفرادی ذمہ داری پر بات ہو رہی ہے۔ اس انفرادی ذمہ داری کو قرآن مجید نے سورۃ لقمان میں نقل کر کے شریعت اسلامی کا حصہ بنا دیا۔ قرآن پاک کے اصول تفسیر میں یہ بات بھی شامل ہے کہ قرآن مجید نے اگر کسی سابقہ آسمانی کتاب یا سابقہ پیغام کو قرآن مجید میں نقل کیا ہے، اور سیاق و سباق سے اس کا منسوخ ہونا واضح نہیں ہوتا تو وہ قرآن پاک کا حصہ ہے۔ اور مسلمانوں کے لیے بھی اسی طرح واجب التعمیل ہے جیسے پہلے لوگوں کے لیے واجب التعمیل تھا۔ یہاں قرآن مجید نے جہاں لقمان کی گفتگو نقل کی ہے وہاں لقمان اپنے بیٹے سے کہتے ہیں کہ یٰبنی اے میرے بیٹے، اقم الصلوٰۃ (نماز قائم کرو)، وامر بالمعروف، (یاد رکھیے کہ یہ صیغہ واحد ہے) اچھائی کا حکم دو۔ وَانْهَ عن المنکر اور برائی سے روکو۔ اس کے واضح طور پر یہ معنی ہیں کہ قرآن مجید میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ایک سطح وہ ہے جو افراد کے لیے ہے اور ہر فرد اپنے دائرے میں اور اپنے حلقۂ اثر میں اس فریضے کو انجام دینے کا پابند ہے۔ جس شخص کے اثرات جہاں جہاں ہیں وہاں وہ ذاتی طور پر اس فریضہ کی انجام دہی کی پابند ہے۔ اگر وہ خاندان کا سربراہ ہے تو خاندان میں، اگر وہ کسی ادارے کا سربراہ ہے تو وہ اس ادارے میں، اگر وہ کسی قبیلے کا سردار ہے تو قبیلے میں، اگر اس کو کوئی اور اثر و رسوخ کسی وجہ سے کہیں حاصل ہے تو جہاں جہاں بھی اس کا حلقۂ اثر ہے وہاں اس کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی انجام دہی کا پابند کیا گیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہاں تک کہ اگر کوئی گروہ ایسا ہو جو اجتماعی طور پر کسی برائی میں مبتلا ہو جائے تو اس پورے گروہ کے خلاف نہی عن المنکر کا فریضہ اجتماعی طور پر انجام دیا جائے گا۔ جب اس برائی کی وجہ سے اس پورے گروہ سے باز پرس کی جائے گی تو ان لوگوں سے بھی باز پرس کی جائے گی جو اس گروہ میں رہتے تھے، لیکن خود وہ برائی نہیں کرتے تھے۔ لیکن برائی سے روکتے بھی نہیں تھے۔ قرآن مجید میں ایک جگہ بیان ہوا ہے کہ فلاں قوم پر اجتماعی طور پر عذاب آیا اور اس قوم کے اچھے اور برے سب افراد عذاب کا شکار ہوئے۔ برے تو اس لیے شکار ہوئے کہ برائی کا ارتکاب کرتے تھے۔ اچھے اس لیے شکار ہوئے کہ کَانُوا لَا یَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ کہ وہ منکر کا ارتکاب کرنے والوں کو منکر کے ارتکاب سے روکتے نہیں تھے۔ لہٰذا اگر کسی معاشرے میں منکر کا ارتکاب کیا جا رہا ہو، اور منکر کا ارتکاب کرنے پر معاشرے میں نکیر یعنی public condemnation بلند نہ ہو، معاشرے سے اس کے خلاف مؤثر ردعمل ظاہر نہ ہو تو پھر وہ پورا معاشرہ مجرم ہے۔ برائی کو دیکھ کر خاص طور پر اپنے حلقہ اثر میں برائی کو دیکھ کر خاموش رہنا یہ ملت اسلامیہ اور امت مسلمہ کے افراد ہونے کے تقاضوں کے خلاف ہے۔

یہ تو فرد کی بات ہوئی۔ اس کے بعد ہر معاشرے میں کچھ جماعتیں یا گروہ ہوتے ہیں۔ وہ گروہ قبائل کی شکل میں بھی ہو سکتے ہیں، وہ گروہ برادریوں کی شکل میں بھی ہو سکتے ہیں اور آج کے لحاظ سے وہ گروہ سول سوسائٹی کا بھی ہو سکتا ہے۔ سول سوسائٹی اصطلاح اگرچہ نئی ہے، لیکن مفہوم نیا نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس طرح کے گروہ ہر دور میں موجود رہے ہیں۔ قرآن مجید نے سول سوسائٹی کو بھی مخاطب کیا ہے۔ ولتکن منکم اُمّة ۔ من عربی زبان میں تبعیض کے لیے استعمال ہوتا ہے، یعنی کسی کل کے کسی جز و یا کسی بڑے گروہ کے جزو کی طرف حوالہ دینے کے لیے۔ جس کو مِن تبعیضیہ کہتے ہیں۔ یعنی کسی بڑے گروہ کے ایک یا بعض پہلوؤں کی نشان دہی کی جائے تو وہاں مِـنْ استعمال ہوتا ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ تم میں ایسی جماعتیں ہونی چاہییں، تم میں ایسے گروہ ہونے چاہییں جو معروف کا حکم دیں اور برائی سے روکیں۔ گویا افراد کے ساتھ ساتھ سول سوسائٹی کی بھی ذمہ داری ہے، معاشرے میں موجود اداروں، تنظیموں اور گروہوں کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی اپنی سطح پر اس فریضے کو انجام دیں)۔

اس کے بعد یہ ذمہ داری پوری امت مسلمہ کی ہے جس کا ذکر اس آیت میں آیا ہے۔ کنتم خیر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اُمۃ یہ مجموعی طور پر مسلمانوں سے خطاب ہے کہ تم بہترین امت ہو جو انسانوں کے فائدے کے لیے نکالی گئی ہے اور تمہارا کام یہ ہے کہ تم معروف کا حکم دو اور برائی سے منع کرو، منکر سے روکو۔

اس کے بعد آخری سطح ریاست کی سطح ہے۔ برائی کا ارتکاب کرنے میں ایک مرحلہ ایسا آتا ہے کہ انسان بغیر ریاست کی قوت کے برائی سے باز نہیں آتا۔ یا بغیر ریاست کی قوت کے وہاں اچھائی پر عمل درآمد مشکل ہو جاتا ہے۔ اگر ریاست وہ وسائل فراہم نہ کرے جو معروف پر عمل کرنے کے لیے کسی علاقہ یا کسی زمانہ میں ناگزیر ہوں تو انسان اپنے فرائض پر عمل درآمد نہیں کر سکتا۔ آج کل کے زمانے میں حج کی مثال لے لیں کہ حج کی کماحقہٗ ادائیگی کے لیے اتنا بڑا آپریشن اور اتنا بڑا عمل درکار ہے کہ جب تک ریاست اس کے لیے سہولتیں فراہم نہ کرے تو بہت سے ممالک کے مسلمان حج نہیں کر سکتے۔ بلکہ ریاست کے تعاون کے بغیر آج کل شاید کسی علاقے کے مسلمان بھی حج نہ کر سکیں۔ اس لیے یہاں ریاست کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ امر بالمعروف کے اس اختیار اور ذمہ داری کے تحت وہ تمام سہولتیں فراہم کرے جو اسلام کے اس اہم فریضہ پر عمل درآمد کے لیے درکار ہیں اور ان تمام احکام کو نافذ کرے جو ریاست کی ذمہ داری میں شامل ہیں۔ اور ان تمام برائیوں سے روکے جن کا روکنا ریاست کی ذمہ داری میں شامل ہے۔

یہ خصائص اُمت ہیں جو قرآن پاک میں بیان ہوئے ہیں۔ امت کے لغوی مفہوم میں ایک اور مختصر سی بات قابل ذکر ہے جو قرآن پاک کے دوسرے مختلف بیانات سے بھی واضح ہوتی ہے۔ قرآن پاک نے ایک بات ہر جگہ یہ کہی ہے کہ ہر شخص کا ایک اجل، ایک مدت مقرر ہے۔ لِكُلِّ امة اجل – اسی طرح ہر گروہ اور ہر امت کے لیے بھی ایک مقررہ وقت ہے۔ خود امت کے لفظ میں اجلیت کے معنی پائے جاتے ہیں۔ ایک محدود اسائنمنٹ، ایک محدود وقت اور ایک محدود ذمہ داری کا مفہوم بھی امت کے لفظ میں پایا جاتا ہے۔ وادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ حضرت یوسفؑ کے قصے میں آتا ہے کہ اُن کو ایک وقت کے بعد یاد آیا۔ گویا یہ امت جو امت مسلمہ کہلاتی ہے اس کی ایک مدت مقرر ہے جس کو اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہی کے علم میں ہے کہ وہ مدت مقررہ کب ختم ہو جائے گی۔ اس لیے امت مسلمہ میں یہ احساس ہر وقت تازہ اور بیدار رہنا چاہیے کہ وہ افراد جو اس کے رکن ہیں ان میں سے ہر ایک کی اسائنمنٹ کی ایک مدت مقرر ہے اور اس مدت کے بعد جو فرصتِ عمل ہے وہ ختم ہو جائے گی۔ یہ فرصت عمل بہت مختصر ہے۔ افراد کی زندگی میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھی اور اقوام وملل کی زندگی میں بھی۔

ان سارے کاموں کی انجام دہی میں اور ان سب ذمہ داریوں کی بجا آوری میں توازن، وسطیت اور اعتدال یہ امت مسلمہ کا لازمی وصف ہونا چاہیے۔ یہ وہ وصف ہے جسے قرآن مجید نے یسر کے لفظ سے بیان کیا ہے۔ یُسر کے لفظی معنی تو آسانی یا سہولت کے ہیں، لیکن یُسر کی ایک بڑی جامع تعریف فقہائے اسلام نے کی ہے۔ یُسر سے مراد ہر وہ صورت حال ہے جو انسانوں کو اپنے فرائض کے انجام دہی میں مدد دے۔ رکاوٹوں کو دُور کرے، مشکلات کو ختم کرے اور مسائل کو حل کرے۔ لہٰذا ایک سطح پر ریاست کی ذمہ داری یہ بھی ہے۔ اور افراد کی ذمہ داری اپنی سطح پر ہے۔ کہ وہ یُسر کے اصول کو اپناتے ہوئے ان تمام سہولتوں کو فراہم کریں جو افراد کو انفرادی یا اجتماعی طور پر اپنے فرائض کی انجام دہی کے لیے درکار ہیں۔

فرائض امت میں سب سے بنیادی فریضہ تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ہے جس پر ابھی بات ہوئی۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک اور اجتماعی فریضہ بھی ہے جو امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہی کی ایک شاخ قرار دیا جاسکتا ہے۔ قرآن مجید میں اس کے لیے تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ جب انسان راہ راست سے ہٹتا ہے تو عموماً اس کے دو اسباب ہوتے ہیں۔ ایک سبب تو یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو غیر معمولی نعمتوں اور وسائل سے نوازا۔ یہ وسائل مادی بھی ہوسکتے ہیں، غیر مادی بھی ہوسکتے ہیں۔ کسی کو اللہ تعالیٰ حسن عطا کرتا ہے تو نزاکت آ ہی جاتی ہے۔ کسی کو اقتدار و اختیار ملتا ہے تو وہ آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ کسی کو شہرت ملتی ہے تو وہ بے قابو ہو جاتا ہے۔ انحراف کے یہ اسباب ہیں جو دنیا میں مادی یا غیر مادی نعمتوں کے حصول کی وجہ سے انسانوں میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگ خود تو صاحب اقتدار نہیں ہوتے، لیکن صاحب اقتدار کے قریب ہونے کی وجہ سے ان میں انحراف پیدا ہو جاتا ہے۔ ع

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

یہ کیفیت بہت سے کمزور قلب و دماغ والوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ اس صورت حال سے نبٹنے کے لیے قرآن مجید نے یہ بتایا کہ اگر انحراف کا سبب نعمتوں کا وفور ہو، مادی وسائل کثرت ہو، تو ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرنی چاہیے۔ یعنی تواصی بالحق۔ اگر ہر شخص دوسرے کو حق کی نصیحت کرتا رہے۔ اور یہ یاد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رہے کہ یہاں نصیحت کی بات ہو رہی ہے، امر کی بات نہیں ہو رہی، اس لیے کہ ایسی صورت میں امر سے کام نہیں چلتا۔ اس کے دل کو اپیل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی روح کو اپیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ دل را بدل رہیست (دل کو دل سے راہ ہوتی ہے)۔ لہٰذا اس انداز میں گفتگو ہوگی تو موثر ثابت ہوگی۔

انحراف کی دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ انسان کسی نعمت سے محروم ہونے کی وجہ سے راہ راست سے بھٹک جاتا ہے۔ مثلاً کوئی شدید بیماری آ گئی تو مایوسی پیدا ہوگی۔ اقتدار تھا وہ ختم ہوگیا تو مایوسی پیدا ہوگی۔ دولت ضائع ہوگئی تو مایوسی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس طرح کے اسباب جہاں پیدا ہوں تو وہاں صبر کی تلقین کی ضرورت پڑتی ہے۔ گویا یہ دو بڑے اسباب انحراف کے اگر موجود ہوں تو پھر ایک دوسرے کو حق یا صبر کی نصیحت کرتے رہنا یہ مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔

ان چار فرائض کے ساتھ بلکہ انہی کے منطقی تقاضے اور عملی مظہر کے طور پر دو بنیادی اور اہم فرائض اور بھی ہیں جن کے بارے میں تھوڑی سی وضاحت درکار ہے۔ ایک فریضہ وہ ہے جس کے لیے احتساب یا حسبہ کی اصطلاح استعمال کی گئی۔ دوسرا فریضہ وہ ہے جس کے لیے نکیر کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ نکیر کے لفظی معنی تو کسی منفی چیز پر ناپسندیدگی کے ساتھ اظہار نفرت کرنے اور اظہار برأت کرنے کے آتے ہیں، لیکن یہاں کسی اخلاقی برائی پر سرعام تنقید کرنے اور غلط کہنے کے ہیں۔ یہ امت مسلمہ کی اجتماعی ذمہ داری ہے کہ اگر معاشرے میں کوئی برائی جنم لے رہی ہو تو ہر صاحب ایمان اور صاحب دل انسان اس کے خلاف کم از کم زبان سے اظہار ناپسندیدگی کرے۔ یہ نکیر کا کم سے کم درجہ ہے جو امت مسلمہ کو کرنا چاہیے۔ لیکن نکیر کے بارہ میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ وہ منکر ہی کے خلاف ہو سکتی ہے۔ غیر منکر کے خلاف کوئی نکیر نہیں ہو سکتی۔ منکر وہ ہے جس کو شریعت نے صراحت اور وضاحت سے منکر قرار دیا ہو۔ یا انسانوں کی عقول سلیمہ اور فطرتِ سلیمہ اس کو منکر سمجھتی ہوں۔ یہ بات کہ کوئی چیز مسلمانوں میں مختلف فیہ ہے یا مسلمانوں میں اس کے بارے میں مختلف آراء پائی جاتی ہیں، یا اس کا تعلق محض کسی کے ذوق سے ہے یا کسی کی ذاتی پسند و ناپسند سے ہے۔ اس کے بارے میں شریعت نے نکیر کا حکم نہیں دیا۔ اس آخری چیز کے بارے میں شریعت نے انسانوں کو آزادی دی ہے کہ وہ اپنے ذاتی ذوق اور شخصی پسند یا ناپسند سے کسی ایک پہلو کو اختیار کر لیں۔

میں ایک چھوٹی سی مثال عرض کرتا ہوں۔ کہ ذاتی ذوق کی بنیاد پر انسانوں کو آزادی دینے کا مزاج

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شریعت نے کیسے بنایا ہے۔ قرآن پاک میں ایک جگہ آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے طیبات تمہارے لیے حلال قرار دی ہیں اور خبیثات تمہارے لیے ناجائز قرار دی ہیں۔ پاکیزہ چیزیں اچھی ہیں اور جائز ہیں۔ ناپاک اور گندی چیزیں تمہارے لیے ناجائز ہیں۔ اور بطورِ مثال کچھ چیزوں کی نشان دہی کر دی کہ طیبات یہ اور اس طرح کی چیزیں ہیں، اور خبیثات فلاں فلاں اور ان کی طرح کی چیزیں ہیں۔ درمیان میں بعض ایسی چیزیں ہو سکتی ہیں جن کے بارے میں ایک شخص کا خیال ہو کہ یہ طیبات میں سے ہیں۔ دوسرے کا خیال ہو کہ یہ خبیثات میں سے ہیں، یا جس میں دونوں پہلو پائے جاتے ہوں۔ ایک شخص کی رائے میں ایک پہلو غالب ہو اور دوسرے شخص کی رائے میں دوسرا پہلو غالب ہو، اس طرح کے معاملات میں شریعت نے انسانوں کو آزاد چھوڑا ہے اور کہا ہے کہ اِستَفتِ قَلبَکَ وَلَو اَفتَاکَ المفتون اپنے دل سے فتویٰ پوچھو، چاہے مفتی کچھ بھی کہے۔

عرب میں ریگستان میں ایک جانور ہوا کرتا تھا ضب۔ اس کا اردو ترجمہ گوہ ہے۔ یہ خرگوش اور چوہے کی درمیانی نسل سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک پہلو سے اس میں خرگوش کے خصائص پائے جاتے تھے اور ایک دوسرے پہلو سے اس میں چوہے یا گھونس کے خصائص پائے جاتے تھے۔ ہمارے مغربی یوپی میں ایک جانور ہوتا تھا جو بڑے چوہے کی طرح ہوتا تھا۔ اس کو گھونس کہتے تھے۔ ضب گھونس اور خرگوش کے درمیان کی چیز تھی۔ ممکن ہے دونوں کے اجتماع سے پیدا ہوا ہو۔ عرب میں بعض لوگ اس کو کھایا کرتے تھے۔ عرب کے بعض علاقوں میں اس کا رواج تھا۔ یہاں تک رواج تھا کہ غیر عرب ان کو طنز کے طور پر کہا کرتے تھے کہ تم گھونس کھاتے ہو۔ فردوسی نے بھی شاہنامہ میں اس طنز کو نقل کیا ہے، کہتا ہے:

ز شیر شتر خوردن و سوسمار — عرب را بجائے رسید است کار
کہ تخت کیاں را کنند آرزو — تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے روز یا اس سے اگلے روز ایک دستر خوان پر تشریف فرما تھے۔ بہت سے صحابہ کرامؓ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں گوہ کا گوشت لایا گیا جو بھنا ہوا تھا۔ آپ کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ گوہ کا گوشت ہے تو آپ نے اس طباق کو آگے سرکا دیا۔ کسی نے پوچھا کہ کیا گوہ حرام ہے؟ آپؐ نے فرمایا: حرام نہیں ہے، لیکن میری طبیعت اس کو پسند نہیں کرتی۔ حضرت خالد بن ولیدؓ وہاں دستر خوان پر موجود

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھے، انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ میں کھالوں؟ آپ نے پلیٹ ان کی طرف بڑھا دی۔ حضرت خالد بن ولید نے حضور علیہ السلام کے دستر خوان پر بیٹھ کر اس کا گوشت کھایا، یہ جاننے کے باوجود کہ حضور علیہ السلام نے ناپسند فرمایا ہے۔ یہ جاننے کے باوجود کہ حضورؐ نے پلیٹ کو اپنے سامنے سے آگے کر دیا۔ لیکن یہ ذوق کی بات تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد بن ولیدؓ پر اپنا ذوق مسلط نہیں کیا۔ یا ان کو پابند نہیں کیا کہ وہ بھی حضور علیہ السلام کے ذوق کی پابندی کریں۔ اگر چہ بہت سے صحابہ نے کی ہوگی۔ اس مثال سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ طیبات اور خبیثات کے درمیان میں کچھ ایسے معاملات ہو سکتے ہیں جہاں کوئی چیز نہ واضح طور پر خبیث ہو اور نہ کسی کا ذاتی ذوق اس کو طیب قرار دینے پر آمادہ ہو۔ طیبات اور خبیثات کے درمیان کے ایسے معاملات میں جہاں انسان کو خود فیصلہ کرنا پڑے یا فقہائے اسلام میں اختلاف پیدا ہو وہاں ذاتی ذوق ہی فیصلہ کن ہوسکتا ہے۔ بعض پرندوں کے بارے میں اختلاف ہمیشہ سے رہا ہے۔ بعض جانوروں کے بارے میں آج بھی اختلاف ہے۔ اس طرح کے ذاتی معاملات میں نکیر نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ یہ منکر نہیں ہے، یہ ایک مختلف فیہ چیز ہے۔

احتساب جس کو کہتے ہیں وہ دراصل محاسبہ ہے جو انسانوں کو ایک دوسرے کا کرنا چاہیے۔ معاشرے کا یہ رنگ کہ مجھے آپ سے دلچسپی نہ ہو اور آپ کو مجھ سے دلچسپی نہ ہو یہ مغربی معاشرے کا رنگ تو ہے اسلامی معاشرے کا رنگ نہیں ہے۔ مغربی معاشرے میں تو کسے رابا کسے کارے نہ باشد والا معاملہ ہوتا ہے۔ کسی کو دوسرے سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ پڑوس کے کمرے میں ایک شخص مر جائے تو پندرہ پندرہ دن اس کی میت کا پتہ نہیں چلتا کہ مر گیا۔ مسلم معاشرے میں یہ انداز نہیں ہونا چاہیے۔ مسلم معاشرے میں جہاں لوگوں کو پانچ وقت جمع ہونے کا حکم دیا گیا ہے، پانچ وقت لوگ ایک جگہ جمع ہوں، ہفتے میں ایک بڑی جگہ جمع ہوں، سال میں دو مرتبہ اور بڑی جگہ جمع ہوں اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ معاشرے میں یکجہتی، وحدت اور ایک دوسرے کے لیے ہمدردی پیدا ہو۔ لوگ ایک دوسرے کے لیے تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کا فریضہ سر انجام دے سکیں۔ اگر آپس میں اس طرح کی میل ملاقات ہی نہ ہو، رہائش کا انداز وہ ہو جو جدید ماحول میں ہو گیا ہے تو نہ تواصی بالحق ہو سکتی ہے نہ تواصی بالصبر ہو سکتی ہے۔ نہ امر بالمعروف ہو سکتا ہے اور نہ ہی نہی عن المنکر ہو سکتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تواصی بالحق اور امر بالمعروف سے یہ خیال نہ ہونا چاہیے کہ اسلامی معاشرہ بہت سخت گیر اور بڑا millitant قسم کا معاشرہ ہوگا۔ یا اسلامی سوسائٹی میں بہت شدت ہوگی۔ شدت پسندی ہوگی، کچھ لوگ ڈنڈا لیے ہوئے ہر ایک کے پیچھے پھرتے ہوں گے۔ یہ تصور درست نہیں ہے۔ جو آزادی شریعت نے دی ہے اس کی حدود معلوم و متعین ہیں۔ ہر شخص کو آزادی ہے جس طرح سے زندگی بسر کرنا چاہے وہ کرے۔ شریعت نے عبادات، عادات، معاملات اور مکارم اخلاق ان سب کے درمیان فرق رکھا ہے۔ عادات یعنی جو انسانوں کی social habits ہیں، ان کے کھانے پینے کے طریقے ہیں، ان کے لباس کے طریقے ہیں ان کے رہن سہن کا انداز ہے جب تک وہ شریعت کی عمومی حدود کے مطابق ہے اس میں شریعت نے مکمل آزادی دی ہے۔ اور کسی انسان کو حق نہیں دیا کہ وہ دوسرے کی عادات کے بارے میں بلاوجہ مداخلت کرے۔ معاملات کے بارے میں شریعت نے چند حدود مقرر کر دی ہیں جن کی تعداد دس پندرہ سے زیادہ نہیں ہے۔ اگر معاملات ان دس پندرہ قواعد کے مطابق ہوں تو سارے معاملات جائز ہیں۔ اس طرح کے معاملات میں کسی کو نکیر کی اجازت نہیں ہے۔ نکیر کا حکم وہاں ہے، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کا حکم وہاں ہے، جہاں واضح طور پر کسی منصوص حکم کی کھلم کھلا یا اجتماعی طور پر خلاف ورزی ہو رہی ہو اور خلاف ورزی نے منکر کی حیثیت اختیار کر لی ہو۔

امام شافعیؒ نے اس کی ایک مثال بیان کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی ایک موقع پر غلطی کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ منکر نہیں ہے۔ مثلاً جماعت سے نماز کا حکم دیا گیا ہے۔ کسی شخص کا جماعت سے نماز نہ پڑھنا منکر نہیں۔ کسی کو اس پر اعتراض کا حق نہیں ہے۔ الّا یہ کہ اس کا کوئی اہل خاندان ہو، باپ بیٹے کو کہہ سکتا ہے، استاد شاگرد کو کہہ سکتا ہے، قبیلے کا سردار اپنے قبیلے کے لوگوں کو کہہ سکتا ہے، مربی اپنے زیر تربیت مریدوں کو کہہ سکتا ہے، وہ الگ مسئلہ ہے۔ لیکن کسی دوسرے غیر متعلق انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس میں مداخلت کرے۔ اگر دو یا تین یا چند انسان جماعت سے نماز نہیں پڑھتے اس کا بھی یہی حکم ہے۔ لیکن اگر پوری بستی میں بستی کے سارے لوگ اتفاق رائے سے جماعت کا انتظام کرنا چھوڑ دیں تو پھر یہ منکر ہو جائے گا اور دوسری بستی کے لوگوں کی ذمہ داری ہوگی کہ اس پر آواز بلند کریں اور نکیر کریں۔ اس سے یہ اصول پتا چلا کہ برائی اگر انفرادی ہو تو اس کے اثرات محدود رہتے ہیں اور وہ منکر کی حیثیت تک نہیں پہنچتی۔ لیکن اگر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

برائی کھلم کھلا کی جانے لگے اور اس کا برائی ہونا ہی لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو جانے لگے تو وہ منکر بن جاتی ہے۔ یا چھوٹی برائی بڑے پیمانے پر کی جانے لگے اور لوگ اس کا برا ہونا بھول جائیں یہ بھی منکر کہلاتا ہے اور اس پر نکیر کرنے اور اس کے خلاف آواز اٹھانے کو لازمی قرار دیا جائے گا۔

امت مسلمہ شروع سے ایک کثیر العناصر برادری رہی ہے۔ (کثیر العناصر یعنی plural society)، اپنی تشکیل کے اعتبار سے بھی، اپنے خیالات اور نظریات کے اعتبار سے بھی۔ خود مسلمانوں میں مختلف فقہی مسالک کا وجود، مسلمانوں میں تربیت کے مختلف طریقوں کا وجود، مسلمانوں میں مختلف علمی روایتوں کا تسلسل اور وجود یہ سب اس بات کی دلیل ہے کہ تنوع اور کثرت عناصر امت مسلمہ میں پہلے دن سے شامل رہے ہیں اور امت مسلمہ روز اوّل سے ان خصوصیات کی حامل رہی ہے۔ بلکہ غیر مسلموں کو اپنے نظام اور اپنے ماحول میں رہنے کی مکمل آزادی جتنی اسلام کی روایت میں دی گئی اتنی آزادی کسی اور نظام میں نہیں دی گئی۔ خود یہودی مصنفین نے یہ بات تسلیم کی ہے کہ یہودیوں کی تاریخ میں ان کی آئیڈیل اور مثالی ریاست کے زوال کے بعد جو آئیڈیل حالات انہیں پیش آئے ہیں وہ مسلمانوں کے ساتھ اسپین میں پیش آئے ہیں۔ اسپین میں جو مقام و مرتبہ یہودیوں کو حاصل تھا وہ نہ پہلے ان کو کبھی حاصل ہوا اور نہ بعد میں کبھی حاصل ہو سکا۔ عیسائی مصنفین نے بھی یہ بات تسلیم کی ہے کہ مصر میں پورے اسلامی دور میں عیسائیوں کو جو آزادی حاصل رہی، وہ عیسائیوں کو کسی دوسری غیر عیسائی ریاست میں حاصل نہیں رہی، یہ بات خود عیسائی مصنفین نے تسلیم کی ہے۔ لہٰذا یہ بات کہ مسلم سوسائٹی شروع سے ایک plural معاشرہ رہی ہے اور ایک کثیر العناصر سوسائٹی ہے یہ کبھی بھی محل نظر نہیں رہی۔

شریعت کا بڑا گہرا تعلق امت مسلمہ سے ہے۔ شریعت کسی غیر مرتب یا شتم پشتم قواعد کا مجموعہ نہیں ہے۔ جیسا کہ بعض مغربی مصنفین کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے۔ بلکہ یہ ایک منضبط، مرتب اور عقلی طور پر مستحکم نظام حیات ہے۔ شریعت کا قانونی پہلو وہ ہے جس نے انسانوں کی تمام ضروریات کو اور اپنے اپنے زمانہ کی متمدن ترین مملکتوں اور ریاستوں کے معاملات کو بارہ سو سال کے طویل عرصہ تک منظم کیا ہے۔ شریعت چند بنیادی مقاصد کے حصول کی خاطر کارفرما ہے۔ وہ مقاصد خالصتاً انسانی مقاصد ہیں۔ اس میں مسلم یا غیر مسلم کی کوئی تمیز نہیں ہے۔ اس میں ریاست کے شہری یا غیر شہری کی بھی کوئی تقسیم ایک حد کے بعد نہیں ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ پانچ مقاصد ہیں جن کا حصول شریعت کا اولین ہدف ہے:

۱۔ معاشرے کی روحانی اساس اور اخلاقی اساس کا تحفظ اور دینی تشکیل جس کو تحفظ دین کے نام سے فقہائے اسلام نے یاد کیا ہے۔ دین کے تحفظ کو اولین ترجیح اس لیے حاصل ہے کہ مسلم معاشرہ ایک روحانی معاشرہ ہے، اس کی اساس ایک دینی اساس ہے، اس کی تشکیل دینی بنیادوں پر ہوتی ہے۔ لہٰذا معاشرے کی روحانی اور اخلاقی اساس اور دینی تشکیل کا تحفظ یہ شریعت کا بنیادی اور اولین مقصد ہی ہونا چاہیے۔

۲۔ دوسرا مقصد انسان اور انسانی معاشرے کی جسمانی بقاء اور تسلسل یعنی تحفظ نفس ہے۔ اگر انسانوں کی جان محفوظ نہیں ہے تو معاشرہ محفوظ نہیں ہے۔ معاشرہ انسانوں ہی کے مجموعے کا نام ہے۔

۳۔ تیسرا مقصد ہے تحفظ عقل، یعنی معاشرے کی ترقی اور تہذیبی ارتقاء کی ضمانت۔ اگر انسانوں کی عقل محفوظ نہیں ہے تو تہذیبی ارتقاء کی کوئی ضمانت نہیں ہوسکتی۔ تہذیبی ارتقاء اور مسلم معاشرہ دونوں لازم وملزوم ہیں۔ جہاں مسلم معاشرہ ہوگا وہاں اسلامی تہذیب کا ارتقاء ہوگا۔ جہاں اسلامی تہذیب کا ارتقاء ہو رہا ہوگا وہاں مسلم معاشرہ لازماً موجود ہوگا، امت مسلمہ لازماً موجود ہوگی۔

۴۔ چوتھا مقصد ہے تحفظ نسل۔ جس کے لیے قواعد وضوابط بھی دیے گئے اور نسل کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے اور ملت مسلمہ کے وجود کی ضمانت دینے کے لیے اور اس کی اخلاقی اور روحانی قیود کو برقرار رکھنے کے لیے تحفظ نسل کو ایک مقصد قرار دیا گیا۔

۵۔ آخری اور پانچواں مقصد ہے تحفظ مال، جو ریاست اور معاشرے کے مادی وسائل کے تحفظ، تسلسل اور توسیع سے عبارت ہے۔ مادی وسائل کے بغیر کوئی معاشرہ ترقی نہیں کرسکتا۔ لہٰذا مادی وسائل کے تحفظ اور اس بات کی ضمانت کہ مسلم امت کو مادی وسائل حاصل رہیں، اور جو حاصل ہیں وہ ضائع نہ ہوں اس کے لیے شریعت نے بہت سے احکام دیے ہیں۔

ان تمام مقاصد میں کچھ مقاصد تو دوسرے نظاموں کے ساتھ بھی مشترک ہیں۔ لیکن تحفظ عقل ایک ایسا مقصد ہے جو پہلی مرتبہ اسلامی شریعت نے بیان کیا۔ تحفظ عقل کو بطور مقصد کے دنیا کے بہت سے قوانین اور نظاموں نے اختیار نہیں کیا۔ اس لیے کہ تحفظ عقل کا نہایت گہرا تعلق تہذیب وتمدن سے ہے۔ اس لیے کہ اسلامی تہذیب کی اساس عقل اور فکر پر ہے۔ جبت اور طاغوت پر نہیں ہے اوہام اور خرافات پر نہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے۔ قرآن مجید نے جبت اور طاغوت یعنی اوہام و خرافات اور غیر عقلی، غیر حقیقی تصورات و خیالات کو ناپسندیدہ ٹھہرایا ہے۔ اس لیے عقل کا تحفظ شریعت کا بنیادی تقاضا ہے۔

آج کل کے ماحول میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو پڑھے لکھے لوگوں کی ہجرتیں ہیں جسے عربی میں ہجرت العقول کہتے ہیں (exodus of minds) یہ شریعت کے مقصد تحفظ عقل کے خلاف ہے۔ انسانی عقل کا اتنے بڑے پیمانے پر اخراج ہو اور امت مسلمہ اس سے محروم ہو جائے اور وہ عقلیں جا کر غیر مسلموں کی خدمتیں کریں۔ یہ کم از کم مجھے شریعت کے اس بنیادی مقصد کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ اس پر مسلمان اہل علم کو غور کرنا چاہیے۔

اسلام جو معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے جو امت مسلمہ کے نام سے موسوم ہے۔ اس کی بنیادی اساس علم پر ہے۔ علم، کتاب، درس گاہ، قرطاس و قلم، علم اور علماء، علوم وفنون اور تعلیم و تعلم سے متعلق مضامین قرآن مجید اور احادیث میں اتنی کثرت سے آئے ہیں کہ شاید کسی اور مذہبی کتاب میں اتنی کثرت سے تعلیم و تعلم کے اسباب و وسائل کا تذکرہ نہیں کیا گیا جتنی کثرت سے قرآن مجید اور احادیث پاک میں کیا گیا ہے۔ پرسوں میں نے عرض کیا تھا کہ وحدت علوم مسلمان مفکرین کا ایک بنیادی مضمون رہا ہے جس کا ماخذ قرآن مجید اور حدیث پاک ہیں۔ امت مسلمہ میں اہل علم کو ہمیشہ برتری اور فضیلت کا مستحق قرار دیا گیا۔ قرآن مجید میں ھل یستوی الذین یعلمون والذین لایعلمون (کیا وہ جو جاننے والے (صاحب علم) ہیں اور وہ جو نہیں جانتے، برابر ہو سکتے ہیں؟) کے اعلان کے ساتھ بتایا گیا کہ مسلم معاشرے میں افضلیت اور برتری کا معیار علم اور تقویٰ ہے۔ یعنی علم اور اس کے تقاضوں اور مطالبات پر عمل۔ اگر کوئی شخص علم رکھتا ہے، علم کی کے تقاضوں پر عمل کرتا ہے تو وہ امت مسلمہ میں احترام اور فضیلت کا مستحق ہے۔ قرآن مجید ان علماء کو ناپسندیدہ قرار دیتا ہے جو علم رکھتے ہیں لیکن عمل نہیں کرتے۔ اتامرون الناس بالبر وتنسون انفسکم اسی طرح سے کئی مقامات پر قرآن مجید نے ان تمام مذہبی شخصیتوں کو ناپسندیدہ قرار دیا ہے اور اللہ کی بارگاہ سے دور قرار دیا ہے جو علم رکھنے کے باوجود عمل نہیں کرتے۔ دوسروں کو اچھائی کی دعوت دینے کے لیے آمادہ رہتے ہیں اور خود اچھائی پر عمل نہیں کرتے۔

علم اور اہل علم کی ساری اہمیت کے باوجود یہ بات اسلامی معاشرے کا طرۂ امتیاز ہے کہ اس میں کوئی منظم چرچ نہیں ہے۔ دنیا کے ہر مذہب میں ایک منظم چرچ کو مذہب کا ایک لازمی تقاضا سمجھا جاتا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور ایک منظم چرچ اور مذہبی طبقے کے بغیر دنیا میں مذہبی مراسم پر عمل کرنا ناممکن بتایا جاتا ہے۔ لیکن اسلام وہ پہلا اور آخری تجربہ ہے جس نے کسی منظم چرچ کے بغیر اور ایک منظم کلیسا کے بغیر مذہبی مراسم کی تعلیم دی اور مسلمانوں نے چودہ سو سال میں اس تجربہ کو کامیاب کر کے دکھایا ہے۔

طبقہ اہل مذہب اور روحانیان کا جو کردار امت مسلمہ میں رہا ہے (ہمارے فارسی دوست روحانیان کہتے ہیں) وہ متعدد پہلوؤں پر مشتمل ہے۔ ان کا کردار ایک معلم اور محتسب کا ہے۔ وہ معاشرے کے معلم ہیں۔ معاشرے کے محتسب ہیں۔ اس لیے ان کو معاشرے کے معلم اور محتسب ہی کا کردار ادا کرنا چاہیے۔ ان کا کردار اس کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ مفتی کی حیثیت بھی دراصل ایک معلم کی حیثیت ہے، مفتی کے بارے میں اہل علم نے لکھا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ترجمان اور نائب ہے۔ مفتی نائب رسولؐ ہے۔ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کی تعلیم کو لوگوں تک پہنچایا، اسی طرح ایک مفتی جب فتوئ دیتا ہے تو گویا حضور علیہ السلام کے ترجمان کی حیثیت سے آپ کی تعلیم اور آپ کی شریعت کو لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہے۔

اسلامی تصور کی آخری خصوصیت یا ایک اہم خصوصیت عقل اور نقل کی جامعیت ہے جس میں عقل اور نقل کا امتزاج اتنی گہرائی، اتنی کامیابی اور خوبصورتی کے ساتھ ہے جس کی مثال دوسرے مذاہب و نظریات میں نہیں ملتی۔ یہ بات علامہ ابن تیمیہؒ نے ایک جامع اور بلیغ جملے میں بیان کی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ "صریح المعقول لاینافی صحیح المنقول" کہ جو چیز عقلی طور پر صراحت سے ثابت ہے اس میں اور اس نقلی چیز میں جو صحت کے ساتھ ثابت ہے، یعنی قرآن یا سنت سے، ان دونوں میں کوئی منافات یا تعارض نہیں ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں۔ ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ اسلامی معاشرے میں مسلمان علماء نے عقل اور نقل کو جمع کر کے جو منفرد علمی اور تہذیبی روایت قائم کی اس کی مثالیں اگر دی جائیں تو اسلامی تہذیب کا ایک نیا پہلو سامنے آتا ہے۔ جس میں کتابوں سے محبت، کتاب دانی، کتب خانے، شائقین کتب، علماء کا احترام، علم کی آزادی طرۂ امتیاز کی حیثیت رکھتی تھی۔ ان میں سے ہر مضمون ایسا ہے جس پر ایک طویل گفتگو کی جا سکتی ہے لیکن یہ امت مسلمہ کے ایک بنیادی وصف کو بیان کرتی ہے۔

واخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین

© rasailojaraid.com